R. No. 2180/57

Regd. No. 1922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلی فون — ۲۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ دس نئے پیسے

جلد ۲۳ ۔ شمارہ ۸	ایڈیٹر ۔ آل احمد سرور	۲۲ر فروری ۱۹۶۴ء

اداریہ

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو بہار کی آمد پر صحرا ہرے دھبّوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ جو لوگ گہری نظر ڈالتے ہیں اُنھیں کو یہ پتہ چلتا ہے کہ کہاں سبزے کی دلفریب دھاریں ہیں، کہاں پھولوں نے اپنا سر نکال کر آس پاس کی میلی مٹیالی فضا کو رنگین بنا دیا ہے، کہاں کانٹوں میں نرمی آگئی ہے اور کہاں پودوں میں شادابی۔ اسی طرح قوم کے محسنوں کے کارناموں کا حال ہے انھوں نے وقت کی بساط پر اپنی شخصیت کی لالہ کاری سے جو نقش ثبت کئے ہیں، اُنھیں غور سے دیکھا جائے تو اُن میں فکر کے کتنے اعجاز اور فن کے کتنے کرشمے نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد جس راستے سے گزرے تھے اُس پر نظر ڈالیے تو اُن کے نقشِ پا کے نشانات آج بھی ہم سے کچھ کہتے ہیں۔

یہ کہتے ہیں کہ دیکھو ہمارے سامنے کیا کیا مشکلات تھیں۔ ہماری زندگی کی صبح دیوارِ زنداں کے سائے میں ہوئی تھی، مگر جب اُس کی شام ہوئی تو وطن کی صبحِ بہاراں اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔ ہم نے ایک بڑی طاقت سے ٹکر لی اور اس کے چنگل سے رہائی حاصل کی۔ ہم نے قدیم علوم کے ماحول میں آنکھ کھولی اور جدید علوم سے بھی لگاؤ پیدا کیا۔ ہم نے ایک مذہبی برادری کی ساری خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے، ہندوستان کی قومیت کے تصوّر کو اس طرح دلوں میں بٹھایا کہ بالآخر ہم آزاد ہو گئے۔ ہم نے اپنے ملک کی پوری تاریخ پر نظر رکھی اور اس کے کسی حصّے کی اہمیت کو کم نہ ہونے دیا۔ ہم نے بغاوت کی رہنمائی بھی کی اور جب آزاد ہو گئے تو ملک کی نئی تعمیر کے لئے بھی منصوبے بنائے۔ ہم نے ہندوستان کی ہر زبان سے محبت کی خاطر اپنی زبان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اپنی زبان کی ترقی میں سب زبانوں کی ترقی دیکھی اور دکھائی۔ ہم نے صحافت کو ادب بنایا، تقریر کو جادو، اور تحریر کو حُسن کاری۔ ہم سب سے جُدا رہ کر بھی سب کے رفیق رہے۔

ہم نے عالمی میلانوں اور معیاروں کو اپنایا مگر اپنے راستے، روایات اور مزاج کو ہر حال میں ملحوظ رکھا۔ ہم نے جو منزلیں طے کی ہیں، وہ آج بھی عشقِ بلاخیز کے بہت سے قافلوں کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔

کاش اس حقیقت پر اور دھیان دیا جاتا۔ کاش مولانا کی قوم پرستی، اُن کا اسلام، اُن کے قلب کی وسعت، اُن کی نظر کی گہرائی، اُن کا ماضی کی صالح روایات کا عرفان اور حال کے پیچ و خم کا علم، ہم بھی سیکھتے، کاش ہم اپنی زبان کی خدمت اس طرح کرتے کہ دوسروں کے لئے بھی نمونہ بنتے، کاش ہمیں اپنی تہذیب اس طرح عزیز ہوتی کہ اوروں کو بھی اس سے رغبت ہوتی، کاش ہماری قوم پرستی دوسری قوموں کے لئے نمونہ اور مثال بنتی، کاش ہم انسان سے ہر رنگ میں محبت کر سکتے، کاش ہندوستان کو ہم دیتے زیادہ اس سے مانگتے کم۔ ۲۲ر فروری کا دن ہم سے اس مسئلے پر غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس اشاعت میں

سرِ بیِن

آج سرِبین کے کالم میں مولانا آزاد کی کچھ پُرلطف حکایتیں بیان کی جاتی ہیں :-

جب گاندھی جی نے انفرادی سول نافرمانی کی تحریک چلائی تو کانگریس کے لیڈروں کو ہدایت کی گئی کہ نعرے لگاؤ اور گرفتار ہو جاؤ۔ اُس زمانے میں جب کہ بہت سے لیڈر قید میں جا چکے تھے مولانا آزاد ہی سے سارے ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ کسی من چلے نے اُن سے پوچھا کہ صاحب آپ نے گرفتاری کی کوشش کیوں نہ کی۔ مُسکرا کر فرمانے لگے کہ "کیا تم اس بات کا تصوّر کر سکتے ہو کہ میں نعرے لگاؤں گا؟"

مولانا کو وزیرِ تعلیم ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ اُن کی صحت بھی اچھی نہ رہتی تھی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت کا پہلا ٹرم ختم ہونے والا تھا۔ اخباروں میں چرچا تھا کہ اگلے صدر مولانا کو ہونا چاہیے۔ شاید کانگریس کے حلقوں میں بھی یہ بات چل رہی تھی۔ کسی اخبار نویس نے مولانا سے پوچھا کہ سُنا ہے اگلے صدر آپ ہونے والے ہیں۔ بولے، میرے بھائی، میں اتنے بڑے محل میں اکیلا بیٹھا کیا کروں گا۔ نہیں بھائی یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔"

لُطف کی بات یہ ہے کہ اس پر کسی اخبار میں خط نکلا کہ مولانا نے جمہوریت کے سب سے بڑے عہدے کی توہین کی ہے۔

ایک دفعہ راقم الحروف نے ساہتیہ اکاڈمی کے اُردو کے مشاورتی بورڈ میں بھارتی کویتا یعنی ہندوستانی شاعری کے انتخاب کے لیے اُردو کے شعرا کی کچھ نظمیں پیش کیں۔ مولانا صدر تھے۔ جب میں نے اختر الایمان کا نام لیا تو مُسکرا کر کہنے لگے کہ "ان کا تو نام ہی غلط ہے نظم کیسے شامل کی جا سکتی ہے۔" راقم الحروف نے جواب دیا کہ یہ نام ویسا ہی ہے جیسا خورشید الاسلام کا۔ اس میں نکتہ یہ تھا کہ مولانا ان کے شبلی پر مضمون کی تعریف کر چکے تھے۔ مولانا پھر مُسکرائے اور کہنے لگے "اچھے سمجھوتہ ہو جائے، یہ اپنا نام بدل دیں، ہم ان کی نظم شامل کر لیں۔"

یہ لطیفہ کچھ اس طرح مشہور ہوا کہ اختر الایمان نے بہت بُرا مانا اور "میرا نام" کے عنوان سے خواہ مخواہ ایک سنجیدہ نظم لکھ دی۔

سکندر علی وجد نے حیدرآباد کی ایک مخصوص نشست میں مولانا کو اپنی مشہور نظم "اجنتا" سُنائی۔ وجد سُناتے وقت یہ توقع کر رہے تھے کہ بعض اشعار پر مولانا ضرور داد دیں گے۔ مگر مولانا بالکل خاموش رہے۔ وجد نے ایک عجیب عالم میں نظم ختم کی۔ اب سب چُپ تھے اور مولانا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر مولانا نے اس سکوت کو توڑا اور فرمانے لگے کہ "وجد صاحب آپ کی نظم بہت اچھی ہے۔ آپ شاید کچھ اشعار پر داد کے متوقع تھے، مگر نظم ایسی چیز نہیں کہ بیچ میں داد دی جائے۔ پوری نظم کا ایک تاثر ہوتا ہے وہ اس طرح زائل ہو جاتا ہے۔" یہ سُن کر وجد کی جان میں جان آئی ورنہ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مولانا کو نظم پسند نہیں آئی۔

مولانا کے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے دہلی میں انجمن کی آل انڈیا اُردو کانفرنس ہوئی۔ پروگرام کے مطابق پنڈت نہرو کو افتتاح کرنا تھا۔ زیدی صاحب نے پنڈت جی کا استقبال کیا اور پنڈت جی سے افتتاح کی درخواست کی۔ پنڈت نہرو کی تقریر کے بعد پنڈت سندر لال کو مولانا آزاد کا خیر مقدم کرنا تھا۔ تقریر مختصر ہونی چاہیے تھی۔ پنڈت سندر لال نے مولانا کی قومی و ملکی خدمات پر روشنی ڈالنی شروع کی۔ تقریر اس طرح چلتی رہتی تو نہ جانے کب ختم ہوتی۔ مولانا نے دو تین منٹ کے بعد آہستہ سے کہا "اب تم ہی تقریر کرتے رہو گے، مجھے بولنے کا موقع نہ دو گے۔" ڈائس پر جو لوگ بیٹھے تھے وہ ہنس پڑے۔ پنڈت جی نے جلدی جلدی بات ختم کی اور مولانا تقریر کیلئے کھڑے ہو گئے۔

کلام حیدری کے متعلق غلط بیانی

گرلس اُردو ہائی اسکول گیا کے ایک سرداور کن نے حسب ذیل تحریر اشاعت کے لئے بھیجی ہے :-

جناب کلام حیدری صاحب ممبر مجلس انتظامیہ گرلس اُردو ہائی اسکول گیا نے ۵ر جنوری ۶۴ء کو کونسل گرلس اُردو ہائی اسکول گیا کی میٹنگ میں یہ کہا تھا کہ "بہار یونیورسٹی نے انجمن ترقی اُردو کو اپنے ایک سرکلر کے ذریعے ایک فرقہ وارانہ اور سیاسی جماعت قرار دے دیا تھا، اور اساتذہ اور طلبہ کو انجمن میں شرکت کیلئے منع کر دیا تھا۔ میں اس وقت بدنیہ کالج میں لکچرار تھا۔ میں نے اس سرکلر کی سخت مخالفت کی اور میں نے انجمن کی ممبری سے استعفیٰ نہیں دیا اور لکچرار رہا۔"

اس بیان کو ایک فرضی نام کے فردوسی صاحب نے غلط رنگ میں پیش کر کے حیدری صاحب کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میٹنگ میں کونسل کے سوا عام لوگ نہیں تھے یہ صرف کونسل کی میٹنگ تھی چنانچہ فردوسی نام کا کوئی شخص اس اسکول کا کونسلر نہیں ہے اور نہ تھا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ ایک غلط اطلاع کی وجہ سے کلام حیدری صاحب کے نقطۂ نظر کے متعلق غلط فہمی پھیلی۔ موصوف نے اپنی تقریر میں بہار یونیورسٹی کے سرکلر کا حوالہ دیا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ حکومت نے انجمن کو فرقہ وارانہ اور سیاسی جماعت کہا ہے۔ ہماری رائے میں اس کالج کا انتساب انجمن سے کیا جائے تو یہ نہ صرف انجمن کی خدمات کا اعتراف ہوگا بلکہ کالج کو نقصان پہنچنے کے بجائے اور فائدہ ہی ہوگا۔"

(ادارہ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تنقید پر سمینار

(گذشتہ سے پیوستہ)

سمینار کی تیسری نشست ۹ فروری ۱۹۶۴ء کو صبح ۱۰ بجے پروفیسر احتشام حسین کی صدارت میں ہوئی۔ اس نشست میں پہلا مقالہ "تخلیقی عمل کا نفسیاتی جائزہ" ڈاکٹر انور انصاری نے پڑھا۔ موصوف نے پہلے تخلیقی عمل کی نفسیاتی تعریف کی اور پھر نفسیات کی اصطلاحوں میں اس کے تجزیے کی صورتیں بتائیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو تجزیے مغرب میں ہو رہے ہیں ان کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔

دوسرا مقالہ لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد سید شبیہ الحسن نے "ادبی تنقید اور نفسیات" پڑھا۔ موصوف نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ادب اور اس کے محرکات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ باقاعدہ طور پر علم نفسیات سے استفادہ کیا جائے لیکن علم نفسیات کی بنیاد پر تنقید کا فریضہ انجام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ نفسیات ادب کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کر سکتی۔

تیسرا مقالہ ڈاکٹر وحید اختر نے "جمالیاتی تنقید" پر پڑھا۔ موصوف نے جمالیاتی تنقید کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا اور اس سے جمالیاتی تنقید کے اصولوں کے بارے میں مفید نتائج اخذ کئے اور انھوں نے اس پر زور دیا کہ ادب کی تنقید کے لئے صرف جمالیات کو بنیاد قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ دوسرے سماجی عوامل کو نظر کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

چوتھا مقالہ جناب محمد عتیق صدیقی نے "تذکروں میں تنقید" پر پڑھا جس میں انھوں نے تذکروں پر اجمالاً جو تنقیدی اشارے ملتے ہیں ان کا جائزہ لیا اور تذکروں کی تنقیدی اہمیت پر زور دیا۔

اس نشست کا آخری مقالہ راہی معصوم رضا نے "غزل کی تنقید" پر پڑھا جس میں موصوف نے غزل کی جامع تعریف کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا اور غزل کے موضوع اور اس کی ہیئت کو متعین کرنے کی کوشش کی۔

اس کے بعد ڈاکٹر ملک راج آنند نے "تخلیق اور تنقید" پر ایک پُر مغز تقریر کی۔ موصوف نے مختلف فنون کے تخلیقی عمل کا ذکر کیا، اور اس بات پر زور دیا کہ چونکہ ہر فن دوسرے پر اثر ڈالتا رہتا ہے اس لئے نقاد کا فرض ہے کہ وہ کسی ایک فن کو دوسرے فنون سے الگ کرکے نہ دیکھے۔ انھوں نے تنقید کے تخلیقی ہونے پر اصرار کیا تاکہ تنقید قاری کے ذہن اور جذبے دونوں کو متاثر کر سکے۔

آخر میں صدر جلسہ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں ان مقالوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کی افادیت اور اہمیت کی طرف اشارے کئے۔

اس سمینار کی آخری نشست ۹ فروری کو ۳ بجے منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر عبد العلیم نے کی۔

اس نشست کا آغاز صدر محترم کے مقالے "عربی تنقید کے بنیادی افکار" سے ہوا۔ موصوف نے عربی تنقید کا جائزہ لیا اور یہ بتایا کہ عربی تنقید پر یونانی تنقید کا گہرا اثر ہے اس لئے عربی تنقید کے مطالعے کے وقت ان یونانی اثرات کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہے۔

دوسرا مقالہ ڈاکٹر منیب الرحمٰن نے "نظم کی تنقید" پر پڑھا موصوف نے بتلایا کہ نظم کی عمومی اصطلاح کو غزل کی ریزہ خیالی کے رد عمل کے طور پر استعمال کیا گیا۔ نظم کی بنیاد خیال کے ارتقا پر ہوتی ہے اور اس کے بیان اور اس کی ہیئت کو اسی ارتقا کے پیمانے پر جانچنا چاہئے۔

تیسرا مقالہ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر احتشام حسین نے "ناول کی تنقید" پر پڑھا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ ناول کی کوئی بندھی ٹکی حیثیت نہیں ہوتی اس لئے ناول کی تنقید دوسرے اصناف ادب کے مقابلے میں زیادہ دشوار کام ہے۔ آخر میں انھوں نے فرمایا کہ "ناول" فیلڈنگ کے الفاظ میں "اس عہد کا رزمیہ ہے" اس لئے ناول کے مطالعے میں سماج سے واقفیت زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔

اس مقالے پر ڈاکٹر ملک راج آنند نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستانی زبانوں میں اچھے ناولوں کا فقدان ہے۔ اس لئے ہمارے یہاں اس کی کوئی روایت بھی نہیں ہے۔ یہ بات ایک طرح ناول نگار کو آزادی بھی دیتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار بغیر کسی تقلید کے سہارے کرے۔ ڈاکٹر آنند نے احتشام صاحب کے خیال پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم ہیئت کی کوئی مخصوص شکل دئے بغیر ناول لکھیں تو یہ نامناسب نہ ہوگا کیونکہ ناول کے فن میں اس کی پوری گنجائش ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اس مباحثے میں حصہ لیتے ہوئے فرمایا کہ تھوڑی بہت ہیئت سے بے نیازی (Formlessness) مفید ہے، لیکن ڈاکٹر آنند کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ناول نگار اس سے بالکل بے نیاز ہو جائے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ناول کا آغاز اس وقت ہوا جب نثر نے کافی ترقی کر لی اس لئے ہمارے یہاں ناول کی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب نثر علمی، سماجی، ذاتی اور کائناتی ہر مسئلے کے اظہار پر قادر ہو جائے۔

سرور صاحب نے ناول کے موضوع اور اس کے فن کے بارے میں ٹالسٹائی کے عظیم ناول "جنگ اور امن" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں تاریخ کی واقفیت کا پتہ

چلتا ہے لیکن اس کی اہمیت تاریخ کی صحت میں نہیں ہے بلکہ اس کی بصیرت میں ہے۔ ناول نگار اپنے مواد کو ایک جمالیاتی ہیئت دیتا ہے۔

اس نشست کا چوتھا مقالہ ڈاکٹر قاضی عبدالستار نے "افسانے کی تنقید" پڑھا جس میں موصوف نے اُردو تنقید میں افسانے سے عدم توجہی کا ذکر کیا اور اس بات پہ زور دیا کہ آج کا افسانہ اس عہد کی روح کو پورے طور پہ پیش کر رہا ہے اور ہمارے نقادوں کو چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ پورا انصاف کریں۔ اس لئے کہ ادب کی تنقید کرتے وقت محض شاعری کو ملحوظ رکھنا کافی نہیں ہے بلکہ نثر کے جملہ اصناف علی الخصوص "افسانے" کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔

سمینار کا آخری مقالہ "ڈاکٹر بجنوری اور جدید اردو تنقید" ڈاکٹر خورشید الاسلام نے پڑھا۔ اس مقالے میں موصوف نے بجنوری کو جدید تنقید کا بانی بتاتے ہوئے ان کی تصنیف "محاسن کلام غالب" کا مفصل جائزہ لیا اور تنقید کے ان نئے رجحانات کی طرف اشارہ کیا جو ایک طرف ہندوستان کی قومی تہذیب کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں اور دوسری جانب مغرب کے جدید افکار سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے افتتاحیہ میں تمام مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا اور اس بات کا بھی ذکر کیا کہ اس اجتماع کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ ادھر علی گڑھ میں علمی و ادبی مسائل سے دلچسپی کچھ کم ہوتی جا رہی تھی یا اس بات کی ضرورت ہے کہ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ علمی فضا کو بلند کرنے کے لئے ایسے اجتماع کئے جائیں جن میں علمی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

موصوف نے فرمایا کہ اُردو ادب کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں نہ صرف اُردو ادب بلکہ مختلف زبانوں کے بنیادی افکار کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

علی گڑھ کے منصب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر سرور نے فرمایا کہ علی گڑھ اُردو کا مرکز رہا ہے۔ یہ نہ انگریزی ادب کا مرکز بن سکتا ہے اور نہ ہندی کا۔ یہ اور بات ہے کہ ہندی یا انگریزی ادب میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے بھی اپنانا چاہیئے۔ لیکن علی گڑھ کو اصلاً اُردو ادب کا اور بڑا مرکز بننا ہے۔ سرسید نے اُردو ادب سے بڑا کام لیا ہے اور یہ کام اس کے وارثوں کا بھی ہے کہ وہ ان روایات کو نہ صرف قائم رکھیں بلکہ انھیں آگے بھی بڑھائیں۔ یہ کام سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے، اور اس کے لئے ایک لگن اور ریاض کی ضرورت ہے۔ ؎

اے نوجوان کعبہ بنا اینٹ و حرم کے گرد کھاؤ کسی کا تیر کسی کے شکار ہو

اس طرح یہ اجتماع دو دن کی ہماہمی کے بعد ختم ہوا شعبۂ اُردو کی جانب سے یہ تمام مقالے اور تقریریں کتابی شکل میں عنقریب شایع کی جا رہی ہیں۔ پروفیسر ہمایوں کبیر، ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر ملک راج آنند کی تقریروں کی صدابندی بھی کر لی گئی اور یہ ٹیپ شعبۂ اُردو کے اپنے ریکارڈ میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تقریر

دہلی یونی ورسٹی میں اُردو زبان کی ابتدا اور انیسویں صدی تک اُس کے ارتقا پر تقریر کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے فرمایا کہ اُردو کا ماخذ کسی ایسی مشترک زبان کو قرار نہیں دیا جا سکتا جو منتشر ہو سے قبل ڈیگ سے لے کر الہ آباد تک کے علاقے میں بولی جاتی ہوگی۔ کیونکہ اس کے دو سال بعد شمالی ہندستان میں جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا شروع ہو چکا تھا اور ان کی لسانی انفرادیت واضح ہو چلی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اُردو یقیناً کسی ایسی زبان سے متاثر ہے جو پنجابی، ہریانی، بانگڑو، کھڑی بولی سے ملتی جلتی ہے۔ شروع میں ان کا کوئی تعلق برج بھاشا یا اودھی سے نہیں رہا۔

شمالی ہندوستان میں اُردو زبان کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے امیر خسرو، کبیر، نانک، جعفر زٹلی، اور افضل جھنجھانوی کے کلام سے بحث کی۔ انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ عہد اورنگ زیب کی ایک اردو تصنیف "داستان مہر افروز دل رُبا" اب دستیاب ہو گئی ہے اور وہ خود ان کو ترتیب دے رہے ہیں۔ معراج العاشقین کے باب میں اُنھوں نے فرمایا کہ اس زبان کا عام انداز دہلوی ہے۔ لیکن اس کے اکثر مخطوطات میں جانے (جے) تاکیدی ملتی ہے جو خالص دکن کی پہچان ہے۔ اگر اس خصوصیت کو نظر انداز کر دیا جائے، تو گیسو دراز کی زبان "داستان مہر افروز و دلربا" اور عبدل کے "ابراہیم نامہ" کی زبان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جائے تاکیدی دراصل ان دکنی کاتبوں کی وجہ سے "معراج العاشقین" میں شامل ہو گئی ہے، جنھوں نے اسے اصل دہلوی متن سے نقل کیا ہوگا، اور دکنی بول چال کے مطابق جائے تاکیدی شامل کر دی ہوگی۔

آخر میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے شاہ حاتم اور ناسخ کی تحریکات اصلاح زبان کا جائزہ لیا۔

اسرار اکبر آبادی

لمحے

فضا خموش ہے جیسے خزاں بدوش چمن
فلک پہ رینگنے تاروں میں کچھ اُجالا ہے
شبِ فراق کی ظلمت میں گھٹ رہا ہے دھواں
زمیں کے چاروں طرف سُرمئی سا ہالا ہے
مرے قریب سسکتے ہوئے حزیں لمحو۔
مجھے بتاؤ کہ اس وقت کیا بجا ہوگا؟

نظر کے سامنے ٹھہرا ہوا سمندر ہے
اُتر رہا ہے کناروں پہ، خواب کا جادو
جھپک گئی ہیں ذرا نیند کی گھنی پلکیں،
اُلجھ گئے ہیں کہیں رات کے سیہ گیسو

فضا اُداس ہے جیسے کہ خارزاروں میں
مغنیہ کوئی نغمہ سُنا کے سو جائے
مکاں بھی چپ ہیں کہ جیسے گھٹن کے عالم میں
ہوائیں لور کھلے اور فضا میں کھو جائے

روش روش پہ کھڑے اونگھتے ہیں سنّاٹے
بُجھے بُجھے سے چراغوں کو پھر جلایا ہے
بدن میں درد ہے لیکن مجھے خبر ہی نہیں
مرے حواس پہ شاید کسی کا سایا ہے

خوشی کا ایک بھی منظر نہیں ہے نظروں میں
مگر حیات کی محفل میں کوئی غم بھی نہیں
سکوتِ شب کے شبستاں میں تلخیِ دوراں
مگر سکوت میں نغموں کا کیف کم بھی نہیں
مرے قریب سسکتے ہوئے حزیں لمحو۔
مجھے بتاؤ کہ اس وقت کیا بجا ہوگا؟؟؟

امیر چند بہار

قطعہ

زندہ رہنے کی اس میں قوت ہے
کچھ بھی ہو اب یہ مر نہیں سکتی
ساری دُنیا کی کوئی بھی طاقت
ختم اُردو کو کر نہیں سکتی

بودھن شکر نگر میں جشنِ جمہوریت

۲۵، ۲۶ر جنوری کو انجمن ترقی اُردو شاخ بودھن شکر نگر کے زیرِ اہتمام جشنِ جمہوریہ ہند کا دو روزہ جشن منایا گیا۔

۲۵ر جنوری کی شام کو جمہوریت کے فوائد پر تحریری مقابلہ ہوا، اور اسی روز شب کو نثر نگاری اور بیت بازی کا پروگرام ہوا۔ مقالے پڑھے گئے، اور تقریریں ہوئیں۔

۲۶ر جنوری کو کے۔ راگھلو صاحب سابق صدر مجلس بلدیہ کے ہاتھوں قومی پرچم لہرایا گیا، اور تقریر کی۔

اسی رات ایک غیر طرحی مشاعرہ آر وٹھل راؤ صاحب آئی، اے، ایس۔ کی صدارت میں ہوا۔

صدر محفل جناب آر وٹھل راؤ صاحب نے طلبہ کو انعامات تقسیم کئے اور اپنی تقریر میں انجمن کی کارکردگی پر خوشنودی کا اظہار کیا، اور فرمایا کہ اُردو ہمارا قومی ورثہ ہے جس کی ترقی و حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔

معتمد انجمن ساغر حیدر آبادی کے شکریہ پر محفل برخاست ہوئی۔

بچّوں کے ادب کا انعامی مقابلہ

(بحوالہ ہندوستان ٹائمز) مرکزی وزارت تعلیم نے بچّوں کے ادب کے دسویں انعامی مقابلہ کے لئے مصنفوں اور پبلشروں کو دعوت دی ہے۔ داخلے کی آخری تاریخ یکم مئی ہے۔

ایک ایک ہزار روپیہ کے پندرہ انعامات نمایاں کتابوں یا مسودوں کو عطا کئے جائیں گے۔ ان میں سے دو انعام ہندی کتابوں یا مسودوں کے لئے مخصوص کر دئے گئے ہیں۔ ایک ایک انعام آسامی، بنگالی، گجراتی، کنادہ، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیہ، پنجابی، سندھی، تامل، تلگو اور اُردو زبانوں کی کتابوں یا مسودوں کے لئے مقرر ہے۔ ان انعاموں میں سے دو انعام انعامی کتابوں کے فنکار یا فن کاروں کو دئے جائیں گے۔

محفلِ شعر و سخن

اُردو مجلس بھٹنڈہ کے زیرِ اہتمام جگدیش ملہوترہ ایڈوکیٹ کی صدارت میں "شامِ غزل" کے عنوان سے ایک خصوصی محفل شعر و سخن ترتیب دی گئی۔ صدر موصوف نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اُردو ہماری مشترکہ میراث ہے اس کی حفاظت ہمارا اولین فرض ہے۔

بیکل اتساہی کے گیتوں، عالم فتحپوری کی نظموں اور قیصر حیدری و سلیم لکھنوی کی غزلوں سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ اراکین مجلس نے ہر دوسرے مہینے اس قسم کی محفل منعقد کرنے کی تجویز منظور کی اور اُردو کی توسیع و ترقی کیلئے کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ (جیون لال شرما)

مراسلات

شری وی، ڈی، دیو

محترمی سرور صاحب تسلیم

آپ کو یہ جان کر یقیناً صدمہ ہوگا کہ شری وی، ڈی، دیو انفارمیشن آفیسر اُردو پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا کل دو بجے بعد دوپہر انتقال فرما گئے۔

پرسوں آپ دفتر میں موجود تھے۔ شام کو مجھ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ کل صبح دفتر میں اُن کا ٹیلیفون آیا کہ طبیعت خراب ہے آج نہیں آسکوں گا، اور کوئی چار بجے کے قریب یہ اطلاع ملی کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہوگئے ہیں۔ ع ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

دیو صاحب کے ساتھ میرے مراسم لاہور کے زمانے سے چلے آرہے تھے۔ اُردو کی صحافتی دنیا میں ان کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جب اُن سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی وہ بھائی پرمانند مرحوم کے اخبار "ہندو" میں کام کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ پنجاب کے مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں وہ تقسیم سے قبل ہی دہلی آکر پریس انفارمیشن بیورو کے شعبۂ اُردو سے منسلک ہوگئے تھے اور تقسیم کے بعد اُردو سیکشن کی تنظیم انھیں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔ گویا آپ اس سیکشن کے معمار اول تھے۔ اس کے بعد آپ ترقی پاکر سابق ریاست پیپسو کے ڈائرکٹر آف انفارمیشن کی حیثیت سے پٹیالے تشریف لے گئے تھے۔

جب پیپسو کی ریاست پنجاب میں مدغم ہوگئی تو آپ پہلے پنجاب کے ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن اور پھر پریس انفارمیشن بیورو جالندھر کے انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ اب آپ کچھ مدت سے پھر دہلی واپس آکر پریس انفارمیشن بیورو کے شعبۂ اُردو کے انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کے انتقال سے اُردو کی صحافتی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو پُر نہ ہو سکے گا۔

دیو صاحب اپنی مرنجان مرنج شخصیت کے باعث سارے پریس انفارمیشن بیورو میں اور بالخصوص اردو سیکشن میں بہت مقبول تھے اُن کی موت اُردو سیکشن کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔

کل شام کو جب شمشان بھومی میں اُن کے بے روح جسم کو نذر آتش کیا گیا تو ان کے دوسرے احباب کے علاوہ اُردو سیکشن کے تمام اراکین بھی وہاں موجود تھے اور بادیدۂ پرنم مرنے والے کی روح کیلئے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا تھے۔

امید ہے آپ میری یہ چند سطور ہمارے مرحوم دوست وشن داس دیو کی یادگار کے طور پر "ہماری زبان" میں شائع فرماکر ممنون کریں گے۔ ع

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

(سوگوار، جگن ناتھ آزاد)

۱۰؍فروری ۶۴ء

اُردو کا مستقبل

اُردو کے مستقبل کے بارے میں اب تک جتنے حضرات نے مضامین بھیجے ہیں ان میں صرف دو طرح کے لوگ ہیں۔ اول تو وہ لوگ جو عمل پر یقین نہیں رکھتے اور نہ قوانین فطرت کے اس پہلو پر نظر رکھتے ہیں کہ دنیا میں صالح قوم کا صالح لٹریچر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ نوابوں، جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور درباری امراء اور رؤساء کی حالت جب اس ناگفتہ بہ حالت کو پہنچ گئی کہ بقول ڈپٹی نذیر احمد بارہ دری میں چھٹے سانڈوں کی طرح حسیناؤں کے جھرمٹ میں پھرنے لگے اور دن کے دو دو بجے ان کی صبح ہونے لگی تو ان کی جگہ صالح قوم کو مل گئی۔ دوسری صنف میں وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں اور رجائی ہونے کے باوجود زندہ قوم کے زندہ افراد کی طرح حکومت سے لڑنے کی ہمت نہیں رکھتے اپنے حقوق کے لئے عمل اور جدو جہد کے خشک ریگ زار میں آنا نہیں چاہیے۔ شاید سوچتے ہوں کہ تاریخ خود ہی کروٹ لے گی۔ حالات اور سنگین ماحول کسی سرسید کو جنم دے ہی دیں گے۔ بنگالیوں اور مدراسیوں کی طرح تکلیفیں جھیلنے اور جان دینے پر آمادہ نہیں ہوسکتے۔

امید ہے کہ آپ اُردو کے مستقبل پر بصیرت افروز مضمون سپرد قلم کر کے قارئین کو مطمئن کریں گے۔ (انور فاطمی)

"غلط فہمی" کا ازالہ

محترم جناب نجم سمیع صاحب کا مراسلہ زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ پڑھا۔ ان کی غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ زیر اعتراض جملے سے میرا مطلب یہ تھا کہ اُردو والے ہندی کی مخالفت کر کے اپنے لئے دشواریوں کا دروازہ نہ کھول لیں کہ پھر کسی سرسید کو، ہندی کی تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے جنم لینا پڑے۔ یاد رہے کہ سرسید احمد کا سب سے اہم کام مسلمانوں کو انگریزی کی تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔

میں نجم صاحب سے معافی کا خواستگار ہوں کہ میرا وہ جملہ بہت ہی مفہوم پوشیدہ قسم کا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے وضاحت سے کام لینا چاہیئے تھا۔ بہرحال، نجم صاحب کا مراسلہ میرے لئے تھا بڑا پُر لطف۔ (اقبال کرشن)

ممنون دہلوی کا دیوان

جوہر ٹونکی صاحب نے ممنون دہلی کے دیوان کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ دیوان ممنون کا ایک مکمل مخطوطہ سنٹرل لائبریری بھوپال میں موجود ہے۔ پرنسپل عبد الشکور کے مرتبہ "حسرت موہانی" سے معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب سخن کے سلسلے میں جلد یازدہم حصہ اول میں حسرت نے میر ممنون کے دیوان کا انتخاب شائع کیا تھا۔ (گیان چند)

سلطان اشرف

گزشتہ سے پیوستہ

اُردو کے کچھ قدیم اخبار و رسائل

فروری کے اصلاح سخن میں زبان دہلی ماہانہ، رہنمائے تعلیم لاہور، المجدد لاہور، مشرق ہفتہ وار گورکھپور، آزاد لاہور ماہانہ۔ پانچ رسائل و اخبارات پر تبصرے شامل ہیں' اور نصائح دفا از نواب محمد عمر خاں دفا حیدر آبادی' دانشمند اتالیق۔ از منشی محمد امین خاں صاحب لودیانہ، نقشہ پیداوار ہندوستان۔ از ماسٹر جگت سنگھ منیجر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور کی کتابوں پر بھی تبصرے کئے گئے ہیں۔

"مذہب میں آزاد خیالی اور ذاتی رائے کا قضیہ" اس عنوان سے آغا رفیق بلند شہری کا مضمون شامل ہے۔ اس شمارے میں بھی پہلے شماروں کی طرح "مسئلہ جانشینی اور آغا شاعر" موجود ہے۔ اس ماہ دلگیر اکبر آبادی نے اس سلسلے پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ الف ممدودہ کی بحث اس شمارے میں بھی شامل ہے۔ اس بار نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی نے الف ممدودہ کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔

مارچ کے شمارے میں ایڈیٹر اصلاح سخن نے بعنوان "جانشینی کا تماشا" اپنے خیالات ناظرین کے سامنے پیش کئے ہیں۔ ایڈیٹر نے ساتھ ہی مولانا الطاف حسین حالی کا ایک خط بھی پیش کیا ہے جو بے خود دہلوی کے جانشین داغ تسلیم کئے جانے کے سلسلے میں تھا ہے۔

آئینۂ دل از لالہ چند و لعل۔ معلم البرق، از منشی طالب علی پابند کی کتابوں پر تبصرے اور تہمت، تہمد، یا تہبند" کے موضوع پر رنجور عظیم آبادی کا ایک صفحہ کا مراسلہ شامل ہے کہ صحیح لفظ کیا ہے۔ اسی طرح اشک بلند شہری کا ایک مراسلہ اسی شمارہ میں شامل ہے جس کا موضوع "کل۔ پرسوں" کے بارے میں ہے کہ یہ لفظ گزشتہ اور آئندہ دونوں زمانوں کے لئے بولے جاتے ہیں۔ صاحب مضمون نے اس مراسلے کے ذریعہ اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ اس کے لئے کوئی علیحدہ علیحدہ لفظ ہونا چاہیئے۔

مارچ کے شمارے میں رسم دستار بندی و جانشینی بے خود دہلوی کی تفصیلی خبر اور نقل تقریر مرزا خورشید عالم صاحب بھی شامل ہے۔ ساتھ میں فصیح الملک بہادر داغ دہلوی مرحوم کی سند کی نقل بھی پیش کر دی گئی ہے، اس کے مرتب ممتاز مرزا قیصر دہلوی ہیں۔

اصلاح سخن کے ان سات شماروں میں ملک کے مختلف حصّوں سے شایع ہونے والے رسائل پر جو تبصرے کئے گئے ہیں اُن کی مختصر تفصیل اس طرح ہے۔

صبح بہار۔ یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جو منشی محمد علی صاحب آزاد کے اہتمام سے بمقام جیسور سے شائع ہوتا تھا۔ اصلاح سخن کے ستمبر سنہ ۱۹ء کے شمارے میں صبح بہار کی دوسری جلد کے پہلے شمارے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ صبح بہار میں مضامین نظم و نثر حالات حاضرہ پر شامل ہوا کرتے تھے۔

ایشیا۔ ایشیا ایک ماہوار رسالے کا نام ہے جو امرتسر سے شایع ہوا کرتا تھا۔ قیمت مع محصول ڈاک فی پرچہ آٹھ آنے ہوا کرتی تھی۔ ستمبر سنہ ۱۹ء کے اصلاح سخن میں اس کے پہلے شمارے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ نام کی مناسبت سے اس کے پہلے نمبر میں ایڈیٹر کے قلم سے "ایشیا کی ضرورت" دیگر مندرجات عبد الرحمٰن سیاح، سلیم الدین حیدر بی۔ اے کا مضمون "قدرتی نظارے" قابل ذکر ہے۔ اصلاح سخن کے اس شمارے میں ایشیا کے تبصرہ نگار سردار امرتسری نے ایشیا پر تبصرہ کرتے ہوئے اختتام میں اس طرح لکھا ہے۔

"ہم ڈاکٹر محمد حسین صاحب مالک رسالہ کو دوستانہ مشورہ دیتے ہیں کہ یا تو رسالہ کا اتنا بڑا نام نہ رکھنا تھا اور جو رکھا ہے تو اس کے نباہنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس صورت میں تو زمانہ، مخزن، نوجوان، اردوئے معلّٰی، عصر جدید، شرق و غرب اور اصلاح سخن کے مقابلے میں کوئی ایسی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ ایشیا بھی انھیں کا نام لیوا ہو کر نکلے"

مندرجہ بالا لائنوں میں چند رسائل کے نام آئے ہیں ان میں سے زمانہ، مخزن، اردوئے معلّٰی، عصر جدید، اصلاح سخن، رسائل تو خاصے مشہور رسائل تھے۔ لیکن نوجوان اور شرق و غرب کا حال نہیں معلوم ہو سکا کہ کون لوگ نکالا کرتے تھے۔ اگر کسی صاحب کو ان کے بارے میں علم ہو تو اُردو صحافت کی منتشر کڑیوں کو ملایا جا سکتا ہے۔

فروری، مارچ سنہ ۱۹ء کے شمارے دیکھنے سے مندرجۂ ذیل رسائل کا اور پتہ چلتا ہے:۔

زبان دہلی ماہانہ، رہنمائے تعلیم لاہور ماہانہ، المجدد لاہور ماہانہ، مشرق گورکھپور ہفت روزہ، آزاد لاہور ماہانہ۔

"زبان" دہلی۔ سائل دہلوی کی ایڈیٹری میں دہلی سے ماہانہ نکلتا تھا پہلے نمبر میں خواجہ حسن نظامی اور راجہ دادی و رسا کے فوٹو دئے گئے تھے۔ زبان دہلی کے اس شمارے میں خواجہ صاحب کا مضمون "دیا سلائی" بھی شامل کیا گیا ہے۔

"رہنمائے تعلیم" لاہور۔ یہ رسالہ ماسٹر جگت سنگھ لاہور سے ماہانہ شایع کیا کرتے تھے، بچے نہایت ذوق و شوق سے اس رسالے کو پڑھا کرتے تھے۔

ماسٹر صاحب کا ابھی سنہ ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا ہے۔ رہنمائے تعلیم کی ضخامت ۴۸ صفحات اور قیمت سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے اس زمانہ میں تھی۔

"المجدد" لاہور۔ شیخ محمد عبداللہ تاجر کتب لاہور نے جاری کیا تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد مذہبی تھے لکھائی چھپائی اچھی۔ صفحات ۶۰، قیمت سالانہ دو روپے ہوتی تھی۔

"مشرق" گورکھپور، ہفتہ وار۔ حکیم برہم گورکھپوری نے جاری کیا تھا۔ جس طرح مخزن لاہور کو چلے جانے کے بعد دہلی سے زبان ماہانہ نکالا گیا تھا۔ اسی طرح جب گورکھپور سے حضرت ریاض خیرآبادی "ریاض الاخبار" کو لکھنؤ لے گئے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ گورکھپور سے ایک اخبار نکلے، جو "ریاض الاخبار" کی کمی کو پورا کردے۔ حکیم صاحب نے اسی خیال سے "مشرق" ہفت روزہ جاری کیا تھا۔ حجم ۱۶ سے ۲۰ تک ہفتہ وار اور قیمت چار روپے سالانہ تھی۔

"آزاد" لاہور، ماہانہ۔ یہ رسالہ ایک دفعہ پہلے نکل کر بند ہوگیا تھا۔ پہلے محض ایک ادبی پرچہ تھا۔ لیکن اب منشی بشن سہائے آزاد دہلوی کی ادارت میں نئی جون بدل کر دوبارہ نکلنا شروع ہوا تھا۔

اصلاح سخن میں زیر تبصرہ نمبر آزاد کا کانگریس نمبر تھا جس میں ملک کے مشہور اہل قلم حضرات نے حصہ لیا تھا۔

خاص نمبر ۱۱۲ صفحوں پر نکالا گیا تھا۔ شروع میں ڈاکٹر راش بہاری گھوش کی تصویر دی گئی تھی۔ "افسانہ بربہا" کے عنوان سے لالہ لاجپت رائے کی دلچسپ تصنیف کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ یہ تصنیف لالہ جی کے زمانۂ جلاوطنی کا کارنامہ ہے، خاص نمبر کی قیمت آٹھ آنے رکھی گئی تھی، عام شمارہ چار آنے میں ملتا تھا۔

مندرجۂ بالا اخبارات و رسائل پر روشنی ڈالنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اصلاح سخن کی پالیسی۔ سائز۔ قیمت وغیرہ پر بھی روشنی ڈالتا چلوں۔

اصلاح سخن جون ۱۹۰۸ء سے نکلنا شروع ہوا تھا جیسا کہ میں اوپر ذکر کرچکا ہوں۔ یہ رسالہ کب تک نکلا اس کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ لائبریری میں اس کے صرف سات شمارے ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کے ہیں۔ اصلاح سخن کے پہلے شمارے کے اڈیٹوریل میں اڈیٹر صاحب یوں رقم طراز ہیں:۔

"آجکل اُردو شاعری پر بہت لے دے ہورہی ہے۔ کوئی اس کو مخرب اخلاق اور خلاف تہذیب بتاتے ہیں کوئی بزرگ اس کو جھوٹ اور مُبالغے کا مخزن سمجھتے ہیں۔ آئندہ نمبر سے انشاءاللہ شاعری کے حُسن و قبح پر مفصل بحث کی جائے گی۔"

"یہ رسالہ اسی غرض سے جاری کیا گیا ہے تاکہ موجودہ زمانے کے قدم بہ قدم چل کر اپنے لٹریچر کو درست بنانے کی کوشش کریں۔ اصلاح سخن سے مُراد صرف شاعری ہی نہیں لی جائے گی بلکہ ہر قسم کی بحث جو اُردو زبان سے متعلق ہوگی۔"

اگست کے شمارے سے قواعد و ضوابط میں لکھا ہوا ملتا ہے۔

(۱) "غزل خواہ کتنے ہی شعر کی ہوگی درج کی جائے گی۔ بوس و کنار، کرتی انگیا، وصل و ہجر کے مضامین جو قابل اعتراض سمجھے جاتے ہیں ان سے شعراء کو احتراز واجب ہے۔"

(۲) "طرحی غزلیات کے علاوہ نیچرل نظمیں شایع ہوا کریں گی یہ اور بھی اچھا ہے اگر ہمارے شعراء طرح ہی میں ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کرسکیں۔ اس طرح غزل گوئی کا تنگ دائرہ وسیع ہوجائے گا۔"

اس تفصیل سے یہ اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ اصلاح سخن نکالنے والوں کے پیش نظر اُردو ادب کی اصلاح تھا۔

اصلاح سخن کا سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ اور سالانہ چندہ عا۔ دو روپے۔ قیمت فی شمارہ تین آنے ہوتی تھی۔

سرورق پر ایک گلدستہ بنا ہوتا تھا جس میں شاخوں کے درمیان مختلف عنوانات ہر ماہ لکھے جاتے تھے۔

اڈیٹر وجاہت حسین جھنجھانوی۔ منیجر حافظ سلطان احمد مالک دارالکتب۔ مقام اشاعت قاضی خانہ لاہور۔ اصلاح سخن رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپا کرتا تھا۔

فراق گورکھپوری　　مترجم سید تفضل حسین ایم اے

لسانی پالیسی پر نظرثانی کی ضرورت

(ترجمہ از انڈین ایکسپریس)

۱۱ر نومبر کے اخبار انڈین ایکسپریس میں "ہندی کی غلط روی" کے عنوان سے ایک مضمون میں صحیح اعداد و شمار اور واقعات کی شہادت سے میں نے بخوبی یہ بات ثابت کردی ہے کہ جدید ہندی کے نام نہاد بانیوں نے اُردو کے الفاظ اور محاوروں کو نکال کر ہندی اور اُردو کے درمیان رقابت و اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کردی۔ اس تاریخی غلطی نے ہندی کو اتنا شدید نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔

جدید ہندی کے ان ادیبوں نے اپنے غلط جوش میں نہ صرف عربی فارسی کے ہزاروں عام طور پر بولے جانے والے لفظوں کو اچھوت سمجھ کر برادری سے نکال باہر کیا۔ بلکہ ہزاروں ایسے خالص ہندی لفظوں، محاوروں، فقروں، اصطلاحوں، ضرب المثلوں اور روزمرہ کو بھی نکال پھینکا جن کی بدولت اُردو زبان کو چار چاند لگے اور اس نے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی کا کوئی نعم البدل تو حاصل نہ ہوسکا البتہ بھوتوں کی ایک زبان عالم وجود میں آگئی جس کا نمونہ میتھلی شرن گپت، پنت، پرشاد، نرالا، مہادیوی ورما اور دوسرے جدید ہندی کے ادیبوں کے نام نہاد کارناموں میں پایا جاتا ہے، اُن کی یہ زبان حقیقت میں کوئی زبان نہیں بلکہ بھیانک اور خوفناک آوازوں کا مجموعہ ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ عربی اور فارسی لفظوں کے استعمال سے پرہیز کرنے کا مدعا و مقصد جیسا اُردو نظم و نثر کے بہت سے عظیم شاعروں مثلاً انشا، آرزو اور حالی وغیرہ نے کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے وہ ہندی کے ان خود ساختہ ادیبوں سے بھی نہ ہوسکا۔ اُردو شاعری میں ہزاروں اشعار بلکہ پوری کی پوری نظمیں اور نثر کے حصے ایسے ملتے ہیں جن میں عربی و فارسی کا ایک لفظ بھی نام کو نہیں پایا جاتا بلکہ سو فی صدی خالص ہندی کے تدبھوا الفاظ، فقرے اور محاورے بڑی خوبی سے کھپائے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس جدید ہندی کے مقابلے میں جو ہندی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اُردو ہی صحیح معنی میں ہندی کہلانے کی مستحق ہے۔

مذکورۂ بالا مضمون میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ عربی و فارسی کے لگ بھگ دو ہزار الفاظ ایسے ہیں جنکو ہمارے یہاں کے مرد، عورتیں، بچے، دیہاتی و شہری، کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ، ملک کے عوام و خواص اور مختلف فرقے اور طبقے ہمہ وقت بولتے ہیں اور ان کو ہم بجا طور پر ہندی بولنے والی آبادی میں شمار کرتے ہیں بلکہ آسامی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی اور راجستھانی زبانوں میں بھی قدرتی طور پر ہزاروں عربی و فارسی الفاظ شامل ہوگئے ہیں اور اُن کی تعداد ان زبانوں میں سنسکرت کے تتسم لفظوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔

اسی طرح انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی اور دوسری یورپی زبانوں میں بھی بہت سے الفاظ داخل ہوگئے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ عربی تہذیب و ثقافت کسی زمانے میں دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔

ہندی، ہندو، ہندوستانی کے الفاظ نہ تو سنسکرت سے لئے گئے ہیں اور نہ ہی ہندی یا اور کسی ہندوستانی زبان سے، یہ خالص عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاندار ماضی کی ہندی تصانیف میں سنسکرت کے تتسم لفظوں کو کیا مقام حاصل ہے۔ سور ساگر، تلسی داس، جائسی، رحیم، میرا اور سکھ ساگر کی تصانیف اور زمانۂ ماضی کے تمام ہندی ادب میں جو لاکھوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے سنسکرت کے تتسم لفظوں کی تعداد مشکل سے چھ سات سو سے زیادہ نہ ہوگی اور ان میں سے بھی بہت سے اُردو سے لئے گئے ہیں۔

افسوسناک صورت حال

جدید ہندی کو غلط ہاتھوں میں پڑ کر برے دنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جدید ہندی میں سنسکرت کے تتسم لفظوں کی ٹھونسا ٹھانس سے اور ہندی لفظوں کے جاہلانہ اور سوقیانہ استعمال سے جدید ہندی کے ادیبوں نے ہندی کو ایک مایوس کن گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ سنسکرت کے غلط اور بے موقع استعمال نے ہندی کی صورت بگاڑ دی اور ہندی لفظوں کے بے ڈھنگے استعمال نے ہندی زبان کو مجروح کرکے رکھ دیا۔

جدید ہندی کے ایوان میں کوئی ایسا ہوا دان نہیں جس میں ہر سمت کی ہوا آزادی سے داخل ہوسکے بلکہ وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھری ہے۔ جدید ہندی کے حامیوں کی یہ بنیادی غلطی تھی جو جرم سے بھی بدتر ہے ان نام نہاد ادیبوں میں لفظوں کے انتخاب کی بھی صلاحیت نہیں۔ یہ الفاظ عوام کی زبان میں نہ اچھی طرح سے بسے ہیں اور نہ استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں درحقیقت ہندی کا خون ہو رہا ہے۔

یہ بات اگرچہ ظاہر نہیں کی جاتی مگر مسلمہ حقیقت ہے کہ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے جدید ہندی کے

ادیب قدرتی طور پر احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اُردو کی فضا میں پرورش پانے والے ہندوستانی طبقوں کی زبان دانی حاضر جوابی، زور بیانی، روانی، شہری لب و لہجہ اور جدت ادا کو دیکھ کر ہندی کے مربیوں کے دل و دماغ میں ایک قسم کی پریشانی اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ گمراہ اکثریت کے ظالمانہ عمل نے ظلم کر کے اُردو کو دیس نکالا دے دیا اور اس شیطانی عمل کو ہندی کی نشاۃ ثانیہ کے نام سے موسوم کیا۔

اُردو کو اس طرح میدان سے ہٹا کر ہندی کے انتہا پسندوں نے اب یہ محسوس کیا کہ ہندی کے علاقے میں بلکہ پورے ہندوستان میں اب اُن کو انگریزی تعلیم یافتہ اور انگریزی جاننے والوں سے سابقہ ہے۔ جب تک یہ مقابلے پر رہیں گے ہندی والوں کا چراغ نہیں چلے گا اور اُن کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی سی رہے گی۔

اس لئے اب انھوں نے انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم کو اپنے حملے اور نفرت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا، اور انگریزی کو بھی ہندی کا جانی دشمن قرار دے دیا اور اُسے ہندوستانی تعلیم سے خارج کرنے کے لئے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ ہندی کی اس دوسری غلطی کا نتیجہ اور بھی زیادہ دردناک نکلا۔

مضحکہ خیز طریقۂ کار

ہندی کے حامی یہ بھول گئے کہ انگریزی کوئی دوسری زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہومینٹیز اور سائنس کی اعلٰے معلومات اور تعلیم کا ایک بڑا کامیاب ذریعہ ہے۔ ہندوستان کی کوئی بھی زبان ایسی جامع نہیں ہے جس میں عام معلومات اور دیگر اہم مضامین کی کتابیں ملتی ہوں۔ اس لئے بادلِ ناخواستہ انگریزی کی اہمیت و افادیت کسی حد تک محسوس اور تسلیم کی گئی اور یورپی کتابوں سے ہندی میں ترجمہ کرنے کا منافقانہ ڈھونگ رچایا گیا اور یہ مضحکہ خیز ڈھونگ ابھی تک جاری ہے۔ مگر اس وقت اس بات کا خیال نہیں کیا گیا کہ اصلی اور تخلیقی نظم و نثر لکھنے کے لئے جب یہ جدید ہندی زبان ہی ناکافی ہے تو پھر کم تعلیم یافتہ اور معمولی تنخواہ دار مترجم ہم کو انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں سے کیا قابل اعتبار اور قابل مطالعہ ترجمے پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہی ہوا کہ ان ترجموں کو کوئی پڑھنا گوارا نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی پڑھ پاتا ہے۔

ہندی کے انتہا پسند جنونیوں کو جذبات کی رو میں غالباً اس بات کا خیال نہیں رہا کہ وہ یہ سوچ سکتے کہ انگریزی زبان و ادب جو موجودہ مقام و معیار پر پہنچا ہے وہ محض انگریزی زبان کے جاننے والوں کی ہی تنہا کاوشوں کا نتیجہ نہیں بلکہ اس زبان کے مشہور شاعر اور اہل قلم حضرات مثلاً چوسر، اسپنسر، مارلو، بین جانسن، ملٹن، ڈرائیڈن، پوپ، لوک، ہابس، بیکن، گبن، اڈیسن، جانسن، گولڈ اسمتھ اور انگلینڈ کے بڑے بڑے مشہور ادیب و سائنس داں صرف اپنی مادری زبان انگریزی ہی نہیں جانتے تھے۔ بلکہ اس کے علاوہ وہ اور دو دو تین تین زبانوں سے بھی واقف تھے۔ خود شیکسپیئر جو معمولی سی لاطینی اور اس سے بھی کم یونانی جانتا تھا۔ یونانی، فرانسیسی اور دیگر کئی زبانوں کے اعلیٰ درجے کے مترجموں کا مرہون منت ہے۔

تنگ نظری

آج انگلستان، فرانس، جرمنی، امریکہ، روس یا دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں کوئی بھی طالب علم اسکول یا یونیورسٹی کا امتحان اس وقت تک پاس نہیں کر سکتا جب تک اپنی مادری زبان کے علاوہ وہ کسی دوسری زبان میں بھی امتحان پاس نہ کرے۔ یورپ میں کوئی بھی تعلیم یافتہ آدمی ایسا نہیں جو صرف اپنی مادری زبان ہی جانتا ہو۔ جدید ہندوستان بھی اپنی موجودہ ترقی یافتہ حالت پر صرف ہندی داں لوگوں کی ادبی کاوشوں سے نہیں پہنچا۔ کوئی بھی ہندوستانی ادب ہندی کو شامل کرتے ہوئے زمانۂ حال یا زمانۂ مستقبل میں صرف مادری زبان جاننے والوں کے ہاتھوں پروان نہیں چڑھ سکتا خواہ آپ اس مادری زبان کو راشٹریہ بھاشا کا شبھ نام ہی کیوں نہ دے دیں۔ مادری زبان کے علاوہ انگریزی زبان اچھی طرح جاننے والا صرف ہندی یا ہندوستان کی کسی زبان کے ماہر سے زیادہ بہتر ہے۔

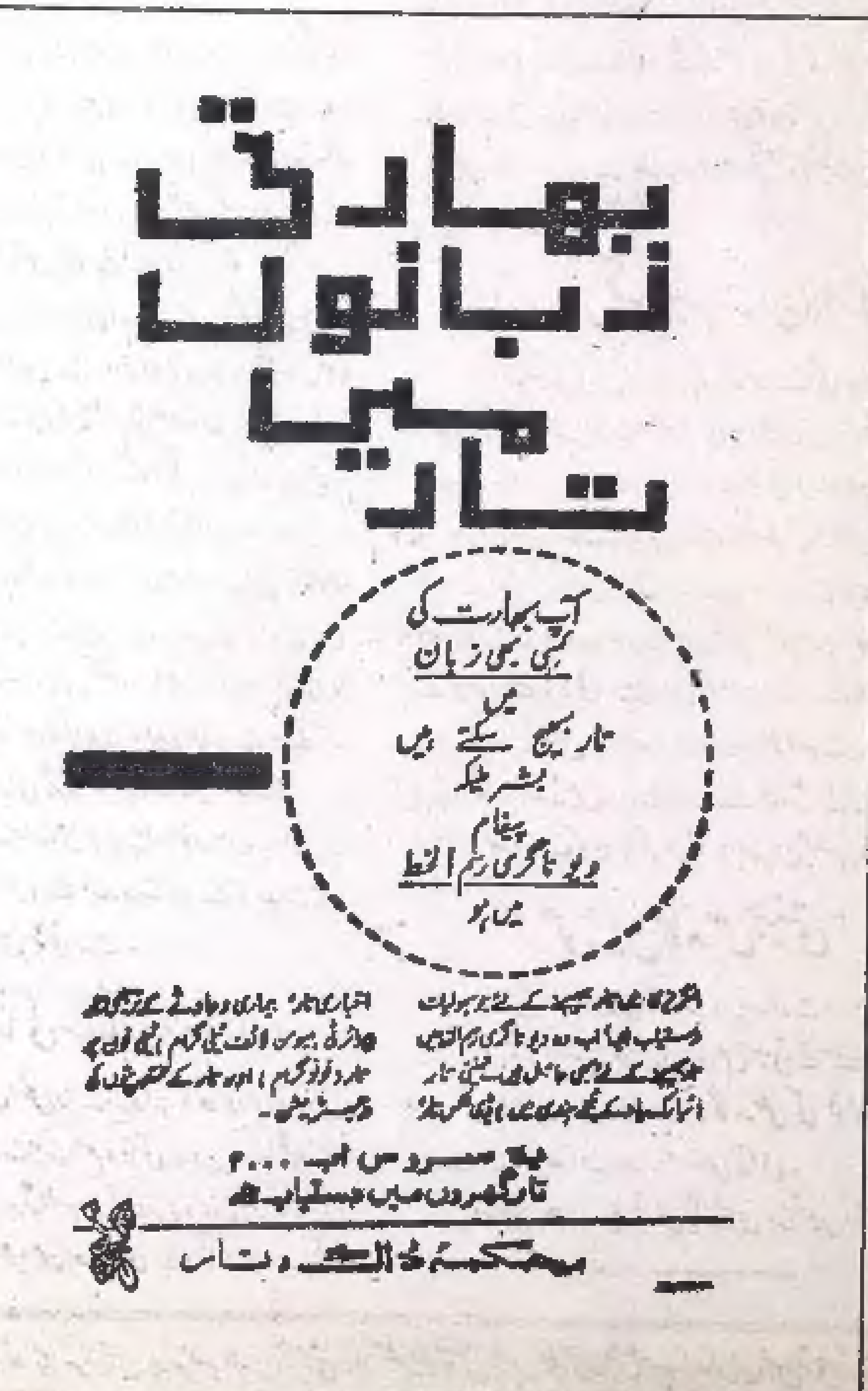
ہندوستان کی کوئی بھی مادری زبان نہ تو کوئی اعلیٰ دل و دماغ کی شخصیت پیدا کر سکتی ہے اور نہ مرد اور عورتوں کی ایسی جماعت پیدا کر سکتی ہے جو ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کی تخلیق کر سکے۔ زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور قومی سرگرمیوں کے دوسرے میدانوں میں جدید ہندوستان کے معمار صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو انگریزی میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں گے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ سب سے زیادہ تباہ کن یہ ناعاقبت اندیشانہ عقیدہ ہے کہ صرف ہندی داں ہی راشٹریہ بھاشا کے ادب اور راشٹریہ کی نئی زندگی کی تخلیق کا باعث ہوں گے۔ ہمیں ہندوستان کو محض ہندی داں طبقے کے رحم و کرم پر نہ چھوڑنا چاہئے بلکہ اُن کے چنگل سے ملک کو جلد چھڑا لینا ضروری ہے۔ اس لئے ہماری تعلیمی اور لسانی پالیسی میں فوری طور پر تبدیلیوں اور نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

سنگم کی ماہانہ ادبی نشست

۹ رفروری بروز اتوار، معمول کے مطابق "سنگم" کی ماہانہ ادبی نشست شری گوپال متل کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی۔ موضوع زیر بحث تھا:۔

"ادب میں فکر اور وجدان کی نسبتی اہمیت" شری گوپی ناتھ آمن نے اظہار خیال کے لئے موضوع زیر بحث پر ایک تفصیلی مضمون پڑھا۔ انھوں نے اردو اور ہندی ادب کا موازنہ کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ ہندی میں وجدانی ادب کا پلڑا اردو سے بھاری ہے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک آداب فن کو برتنے کا تعلق ہے فکر کی اہمیت مسلم ہے، لیکن اعلیٰ ادب کی تخلیق میں بنیادی اہمیت وجدان ہی کو حاصل رہی ہے۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ موجودہ مشینی عہد میں وجدان کی اہمیت کم ہوتی جا رہی اور دروں بینی کی وہ عادت بھی جو ہمارے قدیم فنکاروں کا خاصّہ رہی ہے۔ مضمون پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے شری گوپال متل نے وجدان کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کی وضاحت کی اور کہا کہ یہ اندیشہ غالباً صحیح نہیں کہ موجودہ دور میں وجدانی ادب پیدا نہیں ہوگا۔ اپنی بات کی تائید میں انھوں نے ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری کی مثال پیش کی۔ محسن زیدی نے کہا کہ وجدان دراصل فکر ہی کی ارتفاع یافتہ شکل ہے دیگر حضرات میں شہاب جعفری، جگدیش بنسل، کیول سوری اور بلراج مینرا نے بحث میں حصّہ لیا۔

(مخمور سعیدی)



ہندوستان کا ادب ۱۵ زبانوں میں ہے۔ ان میں انگریزی بھی ہے

اس لئے انگریزی بھی ہندوستان کی ایک زبان ہے۔ امریکی پروفیسر کی رائے

شکاگو ۷ر فروری۔ حال ہی میں یہاں ہندوستان کی جدید افسانہ نگاری کے بارے میں دو کانفرنسیں ہوئیں ان کے دوران ایک نمائندہ نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ انگریزی بھی ہندوستان کی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ کانفرنسیں جدید زبانوں سے متعلقہ ادارے کے اہتمام میں ہوئیں۔

پہلی کانفرنس کا تعلق ہندوستان کے ان افسانوں، یا ناولوں سے تھا جو انگریزی زبان میں امریکا میں مہیا ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں پچاس ہندوستانی مصنفوں کی ایک فہرست تیار کی گئی جن کے ناول اور کہانیاں امریکا میں عام طور پر پڑھے جاتے ہیں۔

موضوع بحث یہ تھا کہ کیا ہندوستانی ناولوں کو انڈر گریجویٹ کلاس روموں یا ثانوی اسکولوں میں رائج کیا جا سکتا ہے۔

ان میں سے کچھ ناول انگریزی زبان میں لکھے گئے اور کچھ ایسے ہیں جو دوسری ہندوستانی زبانوں میں لکھے گئے اور بعد میں انگریزی میں ان کے تراجم بھی چھاپے گئے۔

دوسری کانفرنس میں انگریزی ادب پر بحث کی گئی جو ہندوستانی مصنفوں اور ادیبوں کی تخلیق ہے۔ ان دونوں کانفرنسوں میں امریکا اور دولت مشترکہ کے ماہرین تعلیم اور مصنفوں نے شرکت کی۔

کولمبیا یونیورسٹی نیویارک کے انگریزی کے ایک پروفیسر نے یہ کہا کہ انگریزی بھی ایک ہندوستانی زبان ہے۔

ڈاکٹر الفانسو نے کہا کہ انگریزی بھی ہندوستانی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ دوسرے ممالک میں بھی بولی جاتی ہے۔ ہندوستان میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، یعنی یورپ بھی ریاستہائے متحدہ کی طرح کا ایک ملک ہے۔ یہ فیڈریشن یا یونین شاید آئندہ بیس سال تک معرض وجود میں آجائے۔

پروفیسر نے کہا کہ ہندوستان کا ادب ۱۵ زبانوں میں ہے اور ان میں انگریزی بھی ہے اور اس سے ہندوستان کے "وحدت میں کثرت" کے فلسفے پر روشنی پڑتی ہے۔

پنڈت میلارام وفا کی سالگرہ پر بزم مشاعرہ

لکھنؤ ۱۲ر جنوری، کل رات ترلوک ناتھ کارپوریشن ہال میں اردو شاعر و صحافی پنڈت میلارام وفا کی ۷۰ ویں سالگرہ زیر صدارت سید مظفر حسن وزیر ٹرانسپورٹ اتر پردیش منائی گئی جس میں مسٹر نسیم کنجاہی اور مسٹر امین سلونوی نے وفا صاحب کی شاعرانہ خدمات پر مفصل روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی ساتھ صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس موقع کے لئے جو پیغامات بھیجے تھے وہ بھی سنائے گئے۔

اس کے بعد ایک مشاعرہ وزیر نقل و حمل مسٹر مظفر حسن کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مختلف مقامی شعراء کے کلام کے بعد وفا صاحب نے خود اپنا کلام بھی پیش کیا۔

نظیر اکبر آبادی کے مقبرے کے نزدیک ایک پارک تعمیر کرنے کی اسکیم

(بحوالہ سیاست جدید) آگرے کی میونسپل کارپوریشن نے روضۂ تاج محل کے پیچھے عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کے مقبرے کے نزدیک ایک پارک تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ۵ ہزار روپے منظور کئے گئے ہیں۔ کارپوریشن کے میئر مسٹر کلیان داس جین نے نمائندہ نافین کو بتایا کہ کارپوریشن نے نظیر میموریل کمیٹی سے کہا ہے کہ "اس پارک کا نقشہ تیار کرے"۔ نظیر میموریل کمیٹی ایک نظیر لائبریری قائم کرنے کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ نظیر کی نظموں کا ایک مستند مجموعہ شائع کرے گی۔

اٹاوہ میں تعلیم نسواں کا اسکول

تعلیم نسواں کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اٹاوہ میں لڑکیوں کا اسکول مولوی بشیر الدین مرحوم کی یادگار میں بشیر گرلز اسکول کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے یہ اسکول اب آٹھویں درجے تک پہنچ گیا ہے۔ اسکول کو ہائی اسکول بنانے کے لئے تقریباً پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ اس وقت ۱۲۲ طالبات موجودہ عمارت میں زیر تعلیم ہیں۔ عمارت ضرورت کے لحاظ سے ناکافی ہے۔ ان کاموں کے لئے کافی روپیہ درکار ہے اس لئے اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ بشیر گرلز ہائی اسکول فنڈ میں دامے، درمے حصہ لے کر قوم کی اس بنیادی ضرورت کو پورا کریں۔ (ممبران مجلس انتظامیہ)

"کوٹہ میں گاندھی جینتی"

بتاریخ ۳۰ر جنوری ۱۹۶۴ء زیر صدارت مدن بہاری گپتا شاد ہاؤس کوٹہ جنکشن "مہاتما گاندھی جینتی" کے سلسلے میں جلسہ ہوا۔ صاحب صدر نے مہاتما گاندھی کی قومی خدمات، حیات اور اوصاف پر روشنی ڈالی۔

آخر میں شعراء نے قومی یک جہتی پر نظمیں سنائیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ پبلشر نذیر حسین، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اردو علیگڑھ سے شائع کیا